Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 37, Sr.No.105, 2016 pp 109 - 128

مجلۂ تحقیق
مجلۂ کلیۂ علومِ شرقیہ
جلد ۳۷، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۶ء، شمارہ ۱۰۵

# پاکستانی غزل کے چند نمائندہ شعرا: ایک مطالعہ

محمد طارق☆

**Abstract:**

Hasan Askari raised a slogan of Pakistani literature.There are no two opinions that everycountry has its own civilization and culture.Then whydoes an objection is made on Pakistani literature?The effect of disputes in Pakistani movement also appeared in Urdu literature.Along with fiction, Ghazal in poetry also felt that situation absorbed all pain in itself. This article shows that the Urdu Ghazal made that universal human tragedy a source of its expression.

**Key Words:** محمد حسن عسکری، ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق، پاکستانی ادب کی تحریک
مولانا الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، ظفر اقبال، فیضؔ، ناصر کاظمی

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستانی ادب کی تحریک نے محمد حسن عسکری کی سرکردگی میں سر ابھارا۔اس وقت ترقی پسند تحریک بھی اپنے آخری دموں پر تھی اور حلقہ اربابِ ذوق سے وابستہ اُدبا بھی ابھی گومگو کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ادیبوں کی ایک بڑی تعداد اسی شش و پنج میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ پرانی ڈگر پر چلے کہ نئے ارضِ وطن کے تقاضوں کو سمجھے اور ایسا ادب تخلیق کرے جو ایک نئے وطن کے باسیوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی باعثِ توجہ طلب تھا کہ نئے ملک میں کوئی جادو کی چھڑی نہیں تھی کہ فوراً ہی سارے مسائل حل ہو جائیں۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسائل بہت زیادہ تھے اور وسائل نہ ہونے کے برابر۔فسادات کی پَنڈ سر پر اٹھائے جب وہ لوگ ہندو بلوائیوں کے حملوں، خون آلود ٹرینوں اور سکھوں کے جتھوں سے بچتے بچاتے یہاں پہنچے تو انہیں بھی بے شمار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

☆ پی ایچ۔ڈی سکالر، (ایچ ای سی)، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

دوسرے تمام شعبوں کے ساتھ ساتھ یہ سارا منظر ادب میں دَر آیا۔ ایسے حالات میں ادب کیسے لاتعلق رہ سکتا تھا۔ افسانے میں تو یہ معاملات چلے آئے تھے اور ان پر لکھا بھی جا رہا تھا لیکن شاعری میں غزل نے اس کیفیت کو کچھ اس انداز سے بیان کیا کہ وہ سارے کرب سمٹ کر شاعری میں آ گئے۔

اُردو غزل نے اس عالمگیر انسانی المیے کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور غم کی اس کیفیت کو کسی بھی دوسری صنفِ ادب سے زیادہ محسوس کیا۔ ویسے بھی غزل میں غم کی روایت تو میرؔ کے عہد سے بھی پیشتر رائج تھی جسے میرؔ نے اپنی غزل میں بیان کر کے عالمگیر حیثیت عطا کر دی۔ غزل اور غم کا شروع سے ہی چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، دوسرے لفظوں میں جہاں غم ہو، وہاں غزل نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے عنصر کو بیان کرنے کے لیے بھی غزل ہی قابلِ اعتماد صنفِ ادب ٹھہری۔ ہجرت کے کرب سے دو طرح کی کیفیات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایک تو اپنے آبائی وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے جہاں بچپن اور جوانی گزری ہو یا پھر زندگی کی بیشتر یادیں اسی مٹی سے وابستہ ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء میں بہت سے ایسے افراد جو بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے، وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑنے اور ایک نئے وطن میں آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان رشتوں میں دراڑ بھی اسی جنریشن گیپ کی وجہ سے پڑی۔

انیسویں صدی کے وسط میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد غزل میں اتنی پیش رفت نہ ہو سکی لیکن بیسویں صدی کے پہلے رُبع میں اقبال نے غزل میں اصلاحی پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے اسی طرح کی کوشش مولانا الطاف حسین حالیؔ بھی کر چکے تھے۔ مولانا حالی سے اُردو شاعری جدید دور میں داخل ہوتی ہے۔ مولانا حالی نے اردو غزل کی اصلاح یوں کی کہ تخیل کے زور شور کو کم کر کے واقعاتی زندگی سے قریب کر دیا۔ حالیؔ نے اصلاحِ غزل کی بنیاد مقصدیت، عقلیت اور اخلاقیات پر رکھی۔ حالیؔ تو غزل کے معاملے میں یہاں تک کہہ گئے:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

حالؔی اگر مصلح شاعر ہیں تو اقبالؔ ایک پیام بر شاعر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اقبال کا پیغام انسانی قوتوں کے چھپے ہوئے رازوں کو آشکار کرتا ہے۔ اقبالؔ عقل کے مقابلے میں عشق کے جذبے کو سراہتا ہے۔ انسان کی مسلسل جدوجہد اصل میں عشق و جنوں کی مرہون منت ہے۔ عقل تو روکتی ہے جبکہ عشق آگے بڑھانے والی قوت ہے۔

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے میں سماج میں حقیقت نگاری کی تحریک شروع ہوئی تو غزل نے بھی اپنا رُخ بدلا۔ اس تحریک سے وابستہ شاعروں نے غزل میں سائنسی نقطۂ نظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی حقیقت نگاری کی سچی تصویریں پیش کرنا شروع کر دیں۔ اس دور کی غزل کے موضوعات میں انقلابی تبدیلی کے آثار ملتے ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے قیام کے کچھ ہی عرصے بعد حلقہ اربابِ ذوق کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سے غزل میں کسی حد تک ادبی اقدار کا نزول ہوتا ہے اور ادب برائے ادب کا نظریہ غزل کو کثیف خیالات سے واپس لطیف احساسات و جذبات کی ترجمانی کی طرف لے جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے تقریباً وسط میں قیام پاکستان سے جہاں سیاسی، معاشرتی اور معاشی حالات میں تبدیلیاں آئیں، وہیں انگریزوں کے سارے نوآبادیاتی نظام کا ڈھانچہ بھی بکھر کر رہ گیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ تبدیلی مثبت انداز میں ظہور پذیر ہوتی لیکن ایسا نہ ہو سکا کیوں کہ تقسیم کے نتیجے میں ملکی سرحدیں ہی تبدیل ہوئی تھیں، چہرے نہیں بدلے تھے، مزاج نہیں بدلے تھے، ظلم و جبر کے پیمانے نہیں بدلے تھے۔ اگر یہ سب کچھ نہیں بدلا تھا تو پھر غزل کیسے دکھوں کی جگہ، پھولوں کی نمائش کے اظہارِ بیان کے لیے اپنا دامن وسیع کر سکتی تھی۔

ملک نیا تھا لیکن نظام وہی گھِسا پٹا، فرسُودہ۔ جاگیرداری، زمینداری نظام، کچھ انگریزوں سے اُدھار لیا ہوا۔ غلامانہ ذہنیت رکھنے والے سیاسی زعما سے یہ توقع رکھنا ہی عبث تھا کہ وہ غلامانہ نظام کی مذمت

کریں گے۔اس کے برعکس سوچ پر پہرے بٹھا دیے گئے۔زباں بندی کا دستور نافذ کیا گیا۔سیاست اور ادب ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے۔کسی بھی سیاسی حکومت کے لیے اس ماحول میں ایک غیر جانبدار ادب قابلِ قبول نہیں ہوتا۔حکومتی اقدامات کی شدت دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں تو تھی ہی لیکن ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔غزل پر اس کے اثرات البتہ کم پڑے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل لطیف جذبات کے اظہار میں مدد ومعاون ہوتی ہے۔غزل میں ایسے ماحول میں علامت آ گئی اور بہت سے شعرا حکومتی اقدامات کی وجہ سے علامت کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے کہ اس دور میں جبر کے خلاف مزاحمت کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔جو تھوڑے بہت تھے بھی تو ان کو کسی نے اتنی اہمیت نہ دی۔

غزل میں یہ مزاحمت سے زیادہ علامت کا دور تھا۔پھر اسی علامت و تجرید کی وسیع شکل، نئی لسانی تشکیلات کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔اس دہائی میں درحقیقت نظم کی ہیئت میں توڑ پھوڑ کا عمل زیادہ نظر آتا ہے بہ نسبت اس کے غزل کی ہیئت میں تجرباتی سطح بھی مقبولیت حاصل نہ کر سکی۔یہاں اصل میں غزل کی روایت مضبوط ہونے کی بنا پر اپنا وجود برقرار رکھنے میں کافی حد تک کامیاب رہی۔نظم میں اس کا سہرا جیسے افتخار جالب کے سر بندھتا ہے بالکل اسی طرح ظفر اقبال غزل میں اس کے سرخیل ٹھہرائے جاتے ہیں۔

غزل کا نیا دور ظفر اقبال، شکیب جلالی اور شہزاد احمد سے شروع ہوتا ہے۔ان تینوں شاعروں کے ہاں موضوعات میں فرق کے ساتھ ساتھ سوچ اور فکر کے زاویے بھی الگ الگ نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر رشید امجد کی یہ رائے:

> ''موضوعاتی طور پر ظفر اقبال کے یہاں لاشعور کے تجسیمی اظہار اور سرمئی دھند میں لپٹے پیکروں، شکیب جلالی کے یہاں لہو رنگ تصویروں اور دیہاتی فضا کے استعاروں اور شہزاد احمد کے یہاں رُومانی خمیر میں نفسیاتی گرہ کشائی اور شہری زندگی کے اظہار کے طور پر ظاہر ہوئے۔''(۱)

؎ شیر آ کے چیر پھاڑ گیا مجھ کو خواب میں
دم بھر کو میری آنکھ لگی تھی مچان پر

(ظفر اقبال)

؎ فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا کوئی

(شکیب جلالی)

؎ زندگی بھر مرے رستے میں رہیں دیواریں
جب چلا میں تو مرے ساتھ چلیں دیواریں

(شہزاد احمد)

ظفر اقبال کی نئی لسانی تشکیلات کے عمل کو ادبی سطح پر کوئی خاص پذیرائی نہ ملنے کے اسباب ڈھونڈتے ہوئے ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں کہ ظفر اقبال کی نئی لسانی تشکیلات اور آزاد غزل کے چند تجربے بڑی سطح پر پذیرائی حاصل نہ کر سکے۔ اس کی بنیادی وجہ وہ ہیئتی و تکنیکی نظام تھا جو صدیوں سے غزل کی پہچان بن چکا تھا اور جس کے بغیر شاید غزل اپنا وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتی تھی۔ (۲)

ظفر اقبال نے جدت کے ساتھ ساتھ غزل کی ہیئت میں تجربات بھی کیے۔ ان کی تخلیقی صلاحیت کے بارے میں غلام حسین ساجد اپنے مضمون ''پاکستان میں اُردو غزل'' میں لکھتے ہیں:

> ''وہ جدید بھی اور نئی غزل کے داعی بھی، لسانی تشکیلات کے سرخیل بھی اور اپنے موجودہ اُسلوب کی فرسودگی کے اَسیر بھی۔ انھوں نے اپنی تخلیقی قوت کے ہاتھوں مغلوب ہو کر غزل نے نگار خانے میں کسی بیل کا سا کردار ادا کیا ہے اور دوسروں کو اور اپنے آپ کو رَد کرنے کی کوشش میں بالآخر شاعری ہی کو رَد کر بیٹھے ہیں۔'' (۳)

غلام حسین ساجد مزید لکھتے ہیں کہ ضرورت اس امر کی ہے وہ قافیہ پیمائی کی سطح سے بلند ہو کر اور اپنی ہی غزلوں کی زیرو کس کا پیاں بناتے رہنے کی عادت کو ترک کر کے، ان مضامین اور موضوعاتِ شعری کی طرف متوجہ ہوں جن کی سطح غیر معمولی اور جن کی تاثیر بے کنار ہو اور جو شاعر کے وسیع تجربے اور تخلیقی صلاحیت کے شایانِ شان ہوں۔ ظفر اقبال خود غزل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''شاعری (بالخصوص غزل) کا مزاج، موسم اور ماحول تبدیل ہونا یا کیا جانا چاہیے کیوں کہ یہ اب سامان رسانی سے قاصر ہو چکی ہے اور جس کے اپنے معروضی اسباب

بھی ہیں لیکن اس مستقبل گر صنفِ سخن سے صرفِ نظر بھی نہیں کیا جا سکتا جب کہ اس کی اصل بیماری وہ گھسا پٹا پیرایہء اظہار ہے جس سے باہر نکلنا اب اس کے لیے کچھ زیادہ آسان بھی نہیں رہا۔'' (۴)

ظفر اقبال شاعری کو بھی زندگی کی طرح ہمہ رنگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ شاعری کو صرف روحانی تجربے کے طور پر بھی قبول کرنے کے روادار نہیں ہیں۔ نقاد کلیم الدین احمد نے غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیا تھا جب کہ ظفر اقبال اسے ایک بیہودہ صنفِ سخن کا نام دیتے ہوئے محض ذہنی عیاشی اور ایک غیر شریفانہ طرزِ عمل کہتے ہیں۔(۵) اس کے برعکس غزل کو نیم وحشی صنف قرار دینے کی بحث میں ڈاکٹر انور صابر کا نقطہء نظر کچھ اس طرح سے ہے:

''عہدِ حاضر میں اُردو غزل پر غالباً سب سے سنگین الزام کلیم الدین احمد کا اردو غزل کو ''نیم وحشی صنف سخن'' قرار دینا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ الزام ایک ایسے صاحبِ علم کی طرف سے لگایا گیا جس کی نظر مشرقی اور مغربی شعر و ادب پر گہری ہے۔ گویا شعر و ادب جو تجربوں کے تسلسل کے اظہار کا نام ہے اور غزل کی روایت جسے ایک تہذیب اور معاشرت کے تسلسل کا ترجمان و عکاس کہتے ناقدین کی زبانیں نہ تھکتی تھیں، اسے نیم وحشی ہونے کا طعنہ دیا گیا۔ ادبی رسائل و جرائد میں اس بیان پر بڑی لے دے ہوئی اور کلیم الدین احمد کو غزل کے بارے میں اپنے اس ریمارک پر ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کے دوسرے ایڈیشن میں ترمیم کرنا پڑی اور اس ترمیم کی وجہ فراق گورکھپوری کا یہ تبصرہ تھا کہ ''فارسی اور اردو غزل گوئی تہذیب کے کمال کی پیداوار اور یادگار ہے۔''(۶)

ظفر اقبال کے نزدیک ہمارا غزل گو اول تو محبت کے تجربے سے گزرتا ہی نہیں اور اکثر اوقات دوسروں کے تجربے یا سنی سنائی ہی سے کام چلانے کی کوشش کرتا ہے اور خود اس تجربے سے گزرتا بھی ہے تو اسے شعر میں بیان کرتے وقت اتنے نقاب اور اتنے کپڑے زیبِ تن کروا دیتا ہے کہ اصل تجربے کا بس ایک شائبہ سا ہی دستیاب ہو سکے۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ غزل لکھنے کے لیے شاعر کا محبت کے تجربے سے

گزرنا ضروری ہے۔

ظفر اقبال شاعری کو تازہ، غیر معمولی، حیرت انگیز اور شاعر کو یگانہ و یکتا دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ شاعر کو رجحان ساز دیکھنا چاہتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ناصر کاظمی سے چلنے والا سادگی اور مرصّع سازی کا رجحان ساٹھ کی دہائی میں نئی لسانی تشکیلات کے آنے تک کسی نہ کسی رنگ میں غزل میں موجود رہا۔ اس دہائی میں نئی لسانی تشکیلات کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر رشید امجد کی یہ رائے:

''نئی لسانی تشکیلات کی بحثوں اور اس احساس نے کہ بار بار ایک ہی معنوں میں استعمال ہونے سے لفظوں کا تاثر ختم ہو گیا ہے، نئی لفظیات اور نئی لغت کا احساس دلایا۔ نظم میں اس کا اثر زیادہ ہوا لیکن غزل بھی کسی نہ کسی حد تک اس سے متاثر ہوئی۔ اس کی زبان فارسی سے دور ہوئی، تراکیب کا استعمال کم ہونے لگا۔''(۷)

قیام پاکستان کے بعد پاکستانی غزل گو شاعروں میں وہ شعرا شامل ہیں جو بہت پہلے ہی اردو غزل کے آسمان پر چمک رہے تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ ان میں سے بیشتر شعرا ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ان میں فیضؔ، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، سیف الدین سیف، احمد ریاض، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، عارف عبدالمتین، فارغ بخاری اور قتیل شفائی شامل ہیں۔

فیض احمد فیضؔ ترقی پسند شعرا میں سرفہرست ہیں۔ ان کی غزل میں گھٹن اور جبر کے خلاف احتجاج کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری انقلابی ہے جو معاشرے میں تبدیلی پیدا کرنے کی آرزو رکھتی ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں ترقی پسند تحریک کے مینی فیسٹو ''ادب برائے زندگی'' کی صحیح معنوں میں ترجمانی ملتی ہے۔ فیضؔ کی غزل میں استعارے اور علامتیں اپنے اندر معنی کا ایک جہان لیے نظر آتی ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل میں عشقیہ علامات جیسا کہ قفس، صیاد، گلشن، وغیرہ کو سیاسی رنگ دے کر جاوداں بنا دیا ہے۔ سیاسی نظریات سے قطع نظر فیضؔ کی شاعری میں جمالیاتی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ اسی جمالیاتی رنگ کے بارے میں اپنے شعری مجموعے ''دستِ صبا'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گردوپیش کے مضطرب

قطروں میں زندگی کے دجلے کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔ اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔''(۸)

سوال یہ ہے کہ فیضؔ کی شاعری میں بھی دوسرے شعراء کی طرح غمِ روزگار اور غمِ جاناں کے عناصر ملتے ہیں یا نہیں؟ ایک شاعر کے لیے ان دونوں طرح کے غموں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہوتا لیکن غمِ رُوزگار اور غمِ جاناں کا تصور دوسرے شاعروں کی نسبت فیضؔ کے ہاں مختلف رنگ میں نظر آتا ہے۔ فیضؔ کی غزل کے بارے میں ملاحظہ ہو غلام حسین ساجد کی یہ رائے:

''فیضؔ نے غزل کی زبان، تاثیر اور لَے کو بدلنے کی کوشش نہیں کی اور اس پر بھی اس کے مجموعی مزاج کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ ان کے یہاں غزل کے مستقل استعاروں اور علامتوں نے غیر محسوس طور پر نئے پیکر میں ڈھل کر اُردو غزل کی مجموعی شعریات کو تبدیل کیا ہے اور ترقی پسند رومانیت کی بنیاد رکھی ہے جو اپنے قاری کے باطن کو بدل دینے پر قادر ہے۔''(۹)

فیضؔ کی شاعری کے بارے میں نقادوں کی متضاد رائے بھی ملتی ہیں۔ کوئی فیضؔ کی شاعری میں غنائیت ڈھونڈتے ہوئے اردو غزل پر اس کے مثبت اثرات ڈھونڈتا ہے تو کوئی اسی غنائیت میں جمود کے نمونے تلاش کرتا نظر آتا ہے۔ کوئی فیضؔ کی غزل میں تازہ کاری کے نمونے تلاش کرتا ہے تو کوئی اس کو اشتراکی انقلاب سے جوڑتا ہے۔ کوئی غنائیت سے ہٹ کر خطابت سے غزل کو پاک کرنے کے حوالے سے نجات دہندہ سمجھتا ہے۔ یہی فیضؔ کی کامیابی ہے کہ اس کی غزل مختلف رنگوں کا حسین امتزاج ہے اور ہر کسی کو اپنے اپنے رنگ ملتے ہیں جن پر وہ بحث کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی چیز ان کے لیے کامیابی کی علامت بن گئی ہے کہ وہ ہر دور میں کہیں نہ کہیں زیرِ بحث رہتے ہیں۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی فیضؔ کی غزل میں ایک نئے آہنگ کو تلاش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں اُن کی یہ رائے:

''فیضؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزل کو خطابت اور نعرہ زنی سے نجات دلائی۔ فیضؔ اور جوشؔ میں یہی فرق ہے۔ جوشؔ کے ہاں خطابت اور نعرہ زنی ہے۔۔ فیض

نے غزل کو نیا لہجہ اور نیا آہنگ دیا۔ ان کا لہجہ نرم اور پُرسوز ہے۔ فیض نے غزل میں کئی جہتوں سے توسیع کی۔ فیض کے ہاں تازگی، ندرت اور حسن ہے۔''(۱۰)

جوشؔ کے ہاں پائے جانے والے خطیبانہ لہجے نے بعض ترقی پسند شعراء کو بھی متاثر کیا مثلاً ان میں سردار جعفری، مخدوم، مجازؔ وغیرہ، کے نام قابل ذکر ہیں۔ فیض کے ہاں خطابت کے فقدان کی ایک وجہ تو یہ بھی سامنے آتی ہے کہ فیضؔ کی شاعری میں نکھار آزادی کے بعد زیادہ آیا۔

احمد ندیم قاسمی بھی ترقی پسند تحریک کے ترجمان تھے لیکن شاعری میں ان کی ایک الگ پہچان ہے۔ ان کی شاعری میں جدید فکری رنگ کی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ ایک معروف ادبی رسالے کے مدیر بھی تھے اور انھیں شاعری میں جدید رجحانات اور نئے زاویوں کے داخل ہونے کے بارے میں پتہ چلتا رہتا تھا۔ عظمتِ انسان ندیمؔ کی شاعری کا موضوع ہے جو کسی حد تک اقبالؔ کی شاعری کا بھی موضوع ہے۔ ندیم کی شاعری کا آغاز ان کی لکھی گئی نظم ''محمد علی جوہر'' (۱۹۳۱ء) سے ہوتا ہے۔ ان کی شاعری بھی انسان کے گرد گھومتی ہے۔ انسانی عظمت اور کائنات کے اسرار و رموز کو جاننے کی لگن ہی ان کے شعری سفر کو انفرادیت بخشتی ہے۔ جدتِ فکر اور گہرے مشاہدے کے ساتھ ساتھ تجزیہ کرنے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت انھیں فطرت نے ودیعت کی تھی جس کا استعمال انھوں نے بڑی خوبی سے کیا۔ ملاحظہ ہو احمد ندیم قاسمی کے مجموعے ''لوحِ خاک'' سے ایک غزل:

اپنے خوابوں کے کئی ارض و سما لے جائے گا
قبر میں انسان کیا اِس کے سِوا لے جائے گا
آدمی کے دم سے آئینِ مشیّت زندہ ہے
مر گیا تو ساتھ ہی اپنا خدا لے جائے گا(۱۱)

ظہیر کاشمیری کی غزل میں بھی غزل کا روایتی رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کی غزل میں تاثر کی کمی نظر آتی ہے۔ وہ جدید شعری لسانیات کے معاملے میں بھی محتاط نظر آتے ہیں اور کسی بڑی تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ عارف عبدالمتین کی غزل میں فکر کی بلندی پائی جاتی ہے۔۔ انھوں نے غزل کی فضا کو بدلنے کی کوشش

کی لیکن اس میں انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔اس کوشش میں وہ خود ہی کہیں کھو کر رہ گئے۔سیف الدین سیف کی شاعری میں غنائی عناصر نظر آتے ہیں۔ان کی شاعری میں کلاسیکی رنگ کے علاوہ جدید فکر بھی ملتی ہے۔قتیل شفائی کی غزل میں سیف کی مانند غنائیت پائی جاتی ہے لیکن قتیل کا تخیل انھیں جدید شعراء کی فہرست میں شامل کر دیتا ہے۔قتیل کی غزلوں میں دکھ کے ساتھ ساتھ محرومی کی فضا بھی پائی جاتی ہے۔ان کی غزل میں کلاسیکی رنگ پایا جاتا ہے۔قتیل شفائی کی غزل میں موسیقیت ہے اور جہاں موسیقیت ہوتی ہے، وہاں نغمگی بھی پائی جاتی ہے۔وہ تنہائی میں بھی محفل سجانے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا ہے اور یہی محفل زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

؎ تمہاری انجمن سے اٹھ کر دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوئے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے
نکل کر دَیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انسان خدا جانے کہاں جاتے

فارغ بخاری اور احمد ریاض کی غزل میں ترقی پسندیت کے عناصر زیادہ نظر آتے ہیں۔فارغ کی شاعری میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا اظہار ہوتا ہے۔احمد ریاض کے ہاں بھی ترقی پسند فکر ملتی ہے۔باقی صدیقی چھوٹی بحر کی غزل کہنے والا شاعر ہے۔غزل میں عشق کے معاملات کے علاوہ جو دوسرا رنگ پایا جاتا ہے، وہ سیاسی رنگ ہے۔عبدالحمید عدمؔ رجائیت پسند شاعر ہے۔ان کی غزل میں سادگی اور سلاست پائی جاتی ہے۔ان کا اُسلوب اتنا عمدہ ہے کہ ان کی غزل کی انفرادیت بن جاتا ہے۔ان کی غزل معاشرے میں منافقانہ رویے کو بے نقاب کرتی ہے۔ سراج الدین ظفر کی غزل میں رندانہ مستیاں ملتی ہیں۔ان کی غزل پر فارسی شاعر حافظؔ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ابن انشا کی غزل میں نغمگی پائی جاتی ہے۔ان کی غزل میں طویل بحریں ملتی ہیں۔

قیوم نظر اور یوسف ظفر کا تعلق بھی نظم کے حلقے سے زیادہ ہے لیکن ان دونوں کے ہاں موضوعات میں یکسانیت نظر آتی ہے۔قیوم نظر ہندی الفاظ اور کلچر سے بھی استفادہ کرتے ہیں جبکہ یوسف ظفر کے ہاں

فارسی عمل دخل زیادہ ہے۔ دونوں شاعر روایت کے نمائندہ شاعر ہیں۔ مختار صدیقی کے ہاں انسانیت کی محرومیاں بھی نظر آتی ہیں اور ان کا لہجہ بھی دھیما اور روایت کی نمائندگی کرتا ہے۔۔ مختار صدیقی جدید رنگ میں غزل کہنے والے شعراء کی صف میں بھی شامل ہیں۔ انجم رومانی کی غزل فکری سطح پر یاس یگانہ چنگیزی کا رنگ اپنائے ہوئے ہے۔ وہ روایت اور جدت کے درمیانی راستہ پر چلتے ہیں۔ وہ کبھی روایت سے الفاظ کشید کرتے ہیں اور کبھی جدت طرازی کا دامن تھام لیتے ہیں۔

پاکستانی غزل میں کلاسیکی رنگ کو دوبارہ زندہ کرنے والوں میں ناصر کاظمی سرفہرست ہیں۔ پاکستانی غزل کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے قیام پاکستان کے ساتھ ہی چند نام غزل کے افق پر ایسے ملے کہ جنہوں نے غزل کو سہارا دیا غزل کے اس قافلے کے سالارِ اعظم ناصر کاظمی تھے۔ ناصر کاظمی کے ساتھ اس قافلے میں حفیظ ہوشیار پوری، ابن انشا، مصطفیٰ زیدی، مجید امجد، ضیا جالندھری، ادا جعفری، تابش دہلوی نمایاں ہیں۔ ان شعرا کی کاوشوں کے بارے میں ڈاکٹر وقار احمد رضوی اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''ان شعرا نے مختلف محاذوں پر طبع آزمائی کی۔ نئے افکار کی روشنی پھیلائی۔ ان شعرا کے ذریعہ غزل کی تجدید کا ایک نیا رخ نیا دور شروع ہوا۔ نئی راہوں کی کھوج ہوئی اور بکھرتی ہوئی غزل کو سہارا ملا۔۔۔ ۱۹۴۷ء کے بعد غزل کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ غزل میں میرؔ کی بازیافت ہوئی۔ میرؔ پسندی کا رجحان بڑھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں ناصر کاظمی، ابن انشا، خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔'' (۱۲)۔

شاعری میں ۱۹۴۷ء کی شدت اور ہجرت کے کرب کو جس طرح ناصر کاظمی نے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے، اس کی مثال دوسرے شعرا میں بہت کم ملتی ہے۔ ان کی غزل میں یادِ ماضی کو بہت گہرائی سے محسوس کیا گیا۔ ناسٹلجیا Nostalgia کی کیفیت ناصر کاظمی کی شاعری میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری میں بار بار گذشتہ دور کی عظمتِ رفتہ کو آواز دینے کا عمل نظر آتا ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز الحق رقمطراز ہیں:

> ''ناصر کی شاعری گزرے ہوئے موسم کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں فردا سے زیادہ

غمِ ماضی یا یادِ ماضی ملتا ہے۔ غمِ ماضی یا یادِ ماضی کے حوالے سے وہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب، آہستہ آہستہ ختم ہوئی قدروں اور وہ بزرگ جو ہمارے درمیان سے اٹھتے جارہے ہیں، انھیں یاد کرتے ہیں۔'' (۱۳)۔

ناصر کاظمی کی غزل میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں دونوں ملتے ہیں۔ موضوعات کے تنوع اور لہجوں کی مختلف سطحوں کے اعتبار سے ناصر کاظمی کا شمار اپنے ہم عصروں میں ممتاز حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ ہجرت ان کے اندر ایک ذاتی احساس بن کر ابھری اور ان کی شاعری کا حصہ بن گئی۔ ناصر کاظمی کی غزل میں میرؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ میرؔ کی شاعری میں غم کی ترجمانی جس انداز سے ملتی ہے اور انھوں نے جس طرح اپنے عہد کے غم کی تصویر کھینچی ہے۔ ناصر کاظمی کی غزل اس کی بھرپور ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔ ناصرؔ کے ہاں رنگِ میر کے بارے میں ڈاکٹر وقار احمد رضوی رقمطراز ہیں:

''ناصر کاظمی نے میرؔ کی ہجرت کے تجربے کو تقسیم ملک کے بعد کی ہجرت کے عام تجربے کے تناظر میں دیکھا ہے اور اس سے ذہنی تاثرات اخذ کیے ہیں۔ اس لیے ناصرؔ کے ہاں میرؔ کے رنگ کا اثر ہے۔'' (۱۴)

ملاحظہ فرمائیں ان کے پہلے دیوان ''برگ نے'' سے چند نمونے:

انبالہ کہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

ناصر کی غزل میں علامتوں کا ایک جہان نظر آتا ہے۔ ان علامات میں رفتگاں، تنہائی، یاد، اُداسی وغیرہ میں بھی ناسٹلجیا کی ہی جھلک پائی جاتی ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری سے لگتا ہے کہ وہ ایک تہذیب چھوڑ کر آیا تھا اور دوسری تہذیب میں داخل ہوتے ہی اسے پرانی تہذیب کی یاد شدت سے ستانے لگتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ڈاکٹر انور سدید کی یہ رائے:

''آزادی کے بعد اُردو غزل میں جو شعرا نمایاں ہوئے ان میں ناصر کاظمی اس صنف

کے تہذیبی مزاج آشنا تھے۔ غزل ان کے تجربے کا اظہار اور دل کی واردات تھی۔۔
غزل کا خمیر ناصر کاظمی کی یادوں کے جلے ہوئے بسیرے سے اٹھا تھا۔ اس لیے اس
میں واقعاتی کرب بھی تھا اور آپ بیتی کی دل گرفتہ کیفیت بھی۔'' (۱۵)

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصرؔ
دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی

ناصر کاظمی کے رنگ میں رنگے ہوئے احمد مشتاق کی غزل اپنی ندرت اور تازہ کاری کی بدولت دوسروں سے جدا نظر آتی ہے۔ ان کی غزل میں بھی میرؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اپنے ہونے کا احساس اور وجود احمد مشتاق کی غزل میں ملتا ہے۔ اس کے بعد تو غزل گو شعراء کی ایک بہت بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ غلام حسین ساجد نے اپنے مضمون ''پاکستان میں اُردو غزل'' میں محمد سلیم الرحمٰن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کے ہم عصر غزل گو شعراء کی بھیڑ کو ''بھیڑوں کا گلّہ'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان میں سب سے بڑی تعداد جدت پسند یا جدید غزل گوؤں کی ہے جو غزل کی شعری لفظیات کو مصنوعی کوشش کے ذریعے بدلنے کے کام پر لگے ہیں۔ شہزاد احمد، ظفر اقبال، شکیب جلالی، سلیم احمد، محبوب خزاں، اسلم انصاری، جاوید شاہین، سلیم شاہد، اطہر نفیس، ناصر شہزاد، رئیس فروغ، ذوالفقار تابش اور جون ایلیا اپنی جدتِ طبع، ندرتِ فکر اور تازہ کاری کی بدولت مماثلت ہوئے اس غول سے بہر طور الگ شناخت کیے جاتے ہیں اور ان میں سے بعض اپنے رنگِ سخن کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ (۱۶)۔

مصطفیٰ زیدی کی غزلوں میں جمالیات کا عنصر ملتا ہے جس سے ان کی غزل میں غنائی عناصر کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان کی غزل میں ایک درویشانہ قسم کا اظہار بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر

ہم انجمن میں سب کی طرف دیکھتے رہے
اپنی طرح سے کوئی اکیلا نہیں گیا

انہیں پتھروں پر چل کر اگر آ سکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

حفیظ ہوشیار پوری کے ہاں موضوعاتی تنوع تو اتنا نہیں لیکن روایت کا گہرا شعور ملتا ہے۔ اپنے ہم

عصر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور عابد علی عابد کی طرح یہ کسی خاص نظریہ سے وابستہ نہیں تھے۔ان کو صرف اپنے فن اور زندگی کے تجربات سے ہی غرض ہے۔غزل میں لطیف جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنے والے حفیظ ہوشیار پوری کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ملاحظہ ہو ان کی شاعری سے چند مثالیں:

؎ محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے
اگر تُو اِتفاقاً مل بھی جائے
تری فرقت کے صدمے کم نہ ہوں گے
دلوں کی اُلجھنیں بڑھتی رہیں گی
اگر کچھ مشورے باہم نہ ہوں گے

شان الحق حقی بھی غزل کے شاعر ہیں۔ان کی غزل تازہ فکر کی حامل ہے۔وہ شعریت کے دلدادہ، روایت پر کاربند رہنے والے شاعر ہیں۔جمالیاتی حس ان میں بدرجہءاتم پائی جاتی ہے۔

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے
ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے

ابن انشا جدید شعرا میں سے ہیں۔ان کی غزلوں میں بھی میرؔ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ان کے ہاں تخیل کی بلندی اور احساس کی ترجمانی ملتی ہے۔ان کی غزلوں میں بھی غنائی رنگ پایا جاتا ہے۔قدیم اور جدید کا امتزاج ان کی غزل کی خوبی ہے۔بقول غلام حسین ساجد انشا کے ہاں نظیرؔ کے جوگی اور میرؔ کے روگی نے ایک ہی قالب میں جگہ بنالی ہے۔(۱۷)

؎ انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کا لگانا کیا
وحشی کو سکوں سے کیا مطلب جوگی کا نگر میں ٹھکانا کیا
؎ کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرہ ترا

مجید امجد کی غزل میں ذات کی افسردگی کا عنصر ملتا ہے۔وہ انسانی اقدار کو اہمیت دیتے ہیں۔وہ نظم

کے شاعر ہیں لیکن غزل پر بھی ان کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ مجید امجد کی زندگی تنگی میں گزری جس کا اظہار ان کی ذات سے ہوتا ہوا کائناتی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی غزل میں دکھ کی گہری پرچھائیں بھی نظر آتی ہے:

بڑے سلیقے سے دنیا نے مرے دل کو دیئے
وہ گھاؤ جن میں تھا سچائیوں کا چرچا بھی
میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں جب اِدھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

پاکستانی غزل میں ایک موڑ اس وقت آتا ہے جب ساٹھ کی دہائی میں نئی لسانی تشکیلات کے حوالے سے غزل میں آنے والی تبدیلی کا عمل ستر ۷۰ء کی دہائی میں داخل ہو جاتا ہے اور غزل کے اظہار پر طرح طرح کی قدغن لگائی جاتی ہے۔ پھر اس دہائی کے آخر میں مزاحمتی ادب کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ غزل کا نیا لہجہ سامنے آتا ہے جو علامتوں کے جلو میں آگے بڑھتا ہے۔ اس دور میں پرانی علامتوں کے معنی ہی بدل کر رہ گئے اور انھیں تبدیل شدہ صورتحال کے مطابق استعمال کیا جانے لگا۔ اس دور کے معروف شعراء میں احمد فراز، منظور عارف، سلیم شاہد، افتخار عارف، جان کاشمیری، حمایت علی شاعر، اطہر نفیس، عزیز حامد مدنی، منیر نیازی، عبیداللہ علیم، شہزاد احمد، سلیم احمد، جون ایلیا، شبنم رومانی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، پروین فنا سید کا نام نامی آتا ہے۔

احمد فراز نئی نسل کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی غزل احساسِ تنہائی کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ جمالیاتی رنگ سے بھرپور غزل روایت کی بھی امین ہے۔ فراز کی انفرادیت ان کے لہجے کی مٹھاس ہے:

؎ اب کہ ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں
؎ رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ

آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

فرازؔ نے فیضؔ کے رنگ میں بھی شعر کہے ہیں لیکن فیضؔ کی مقبولیت اور آہنگ کو نہیں چھو سکے۔ ملاحظہ ہو:

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دارو رَسن سے پہلے (فیضؔ)

قصہ اہلِ وفا جانے کہاں تک پہنچے
منزل دار و رَسن ٹھہری ہے تمہید اب کے
(فرازؔ)

منیر نیازی کی غزل میں رائیگاں جانے کا احساس نمایاں ہے۔ ذات کے کھو جانے اور پھر اسے ڈھونڈنے کا عمل منیرؔ کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ جیسے کوئی چیز کھو گئی اور پھر اس پر پچھتاوے کی شکل میں یاس کی لہر یا خوف کی لہر ہو۔ محبت کا جذبہ اور اس میں کھائے ہوئے زخم ان کی غزل میں اکثر ملتے ہیں۔ وہ ہوا، گھٹا، جنگل، شام، نہر، دریا، سمندر، صحرا کی بات کر کے گہری معنویت پیدا کرتا ہے:

اشکِ رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو
اک بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو
یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو

منیر نیازی کی یہ غزل تو اپنے دور کی مشہور و معروف غزل ہے جس میں ہجرت کے کرب کے ساتھ ساتھ نامعتبری کا مضمون باندھا گیا ہے۔

میری ساری زندگی کو بے ثمر اُس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اُس نے کیا
میں بہت کمزور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد

پر مجھے اس ملک میں کمزور تر اُس نے کیا(۱۸)

خورشید رضوی کا شمار دورِ حاضر کے منفرد شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کی غزل میں ایک تازگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ان کی غزل میں مٹھاس اور خوب تر کی تلاش ملتی ہے۔وہ پیکر تراشی اور تمثیل کاری کے نمونوں کو بھی استعمال کرتے ہیں، وہ شہری اور دیہاتی منظر نامہ بھی بیان کرتے ہیں، ان کے ہاں علامتوں کی دنیا بھی آباد ہے اور استعارے اور تلازمے سے بھی وہ اپنی غزل کو ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔

میں سوچتا تھا کہ وہ زخم بھر گیا کہ نہیں
کھلا دریچہ ، در آئی صبا، کہا کہ نہیں

نئی غزل کے بارے میں ملاحظہ فرمائیں رشید امجد کی یہ رائے:

''موضوعاتی طور پر بھی نئی غزل خارج اور باطن کی سرحدوں پر دونوں انتہاؤں کو ملا کر فرد اور اجتماع کے رشتوں ہی کو مضبوط کرنے کا سبب نہیں بنی بلکہ زمین سے اٹھ کر کائنات کی وسعتوں میں جھانکنے کے لیے دریچے کا کام کر رہی ہے۔غزل کی یہ وسعت، ایمائیت، اشاریت اور رمزیت ہی ہر دور میں اس کی مقبولیت اور پسندیدگی کا سبب بنی رہی ہے۔ ہر دور میں شاعروں نے غزل کہنے کو اپنے فن کی معراج سمجھا ہے۔''(۱۹)۔

بہر طور آج کی غزل قدیم و جدید کا حسین امتزاج بھی ہے اور جدت کاری کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ جسے دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کی غزل عروج کی طرف گامزن ہے۔جس میں نئی نسل کے شاعر اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں اور غزل کا دامن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔اس نسل کی نمائندگی کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سے چند نام یہ ہیں۔ یوسف حسن، نوید رضا، نذیر قیصر، منصور آفاق، مقبول عامر، معین نظامی، محسن چنگیزی، حسن رضوی، محسن احسان، شہاب صفدر، محسن نقوی، افتخار شفیع، احمد رضوان، مرتضیٰ برلاس، ، غلام محمد قاصر، ابرار احمد، امجد اسلام امجد، عباس تابش، عامر سہیل، کاشف حسین غائر، ضیاء الحسن، صغرا

صدف، صابر ظفر، شہاب صفدر، شناور اسحاق، شفیق سلیمی، شفقت تنویر مرزا، شبنم شکیل، شبنم رومانی، نعیم ثاقب، سلیم شاہد، سلیم کوثر، شاہدہ حسن، شاہین عباس، انجم سلیمی، زاہد فخری، سرفراز سید، ایوب خاور، سعود عثمانی، شاہد ذکی، سعد اللہ شاہ، سیف الدین سیف، سیف زلفی، فخر الحق نوری، فاطمہ حسن، غلام حسین ساجد، خالد احمد، خالد اقبال یاسر، حسن عباس رضا، ناصر زیدی، کرامت بخاری، رفیع رضا، سرور انبالوی، عطاء الحق قاسمی، تحسین فراقی، اعتبار ساجد، اقبال ساجد، عظیم اقبال، شفقت رسول مرزا کے علاوہ بے شمار غزل گو کی بدولت غزل اپنے قدموں پر کھڑی ہے۔

☆☆☆☆

## حواشی

۱۔ ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۴۱

۲۔ ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۴۱

۳۔ غلام حسین ساجد، پاکستان میں اُردو غزل (مضمون) مشمولہ سہ ماہی ''آئندہ''، پاکستانی ادب نمبر، کراچی، جلد ۱۱، شمارہ ۴۱، جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۱۷

۴۔ ظفر اقبال، تبدیلی کی ہوائیں، پھکڑ پن اور برقع پوش غزل (مضمون) مشمولہ سہ ماہی ''آئندہ''، پاکستانی ادب نمبر، کراچی، جلد ۱۱، شمارہ ۴۱، جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۵۰۔۵۱

۵۔ ایضاً، ص ۵۵

۶۔ ڈاکٹر انور صابر، پاکستان میں اُردو غزل کا ارتقاء، لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، ۲۰۰۲ء، ص ۸۰۹

۷۔ ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۵۳

۸۔ فیض احمد فیض، دیباچہ دستِ صبا مشمولہ کلیات فیض (نسخہ ہائے وفا)، لاہور: مکتبہ کارواں، س ن، ص ۱۰۳

۹۔ غلام حسین ساجد، پاکستان میں اُردو غزل (مضمون) مشمولہ سہ ماہی ''آئندہ''، پاکستانی ادب نمبر، کراچی، جلد ۱۱، شمارہ ۴۱، جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۶۲

۱۰۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی، تاریخِ جدید اُردو غزل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء، ص ۶۸۸

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، لوحِ خاک، محیط مشمولہ (ندیم کی غزلیں)، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۹

۱۲۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی، تاریخِ جدید اُردو غزل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء، ص ۷۹۷

۱۳۔ ڈاکٹر ممتاز الحق، جدید غزل کا فنی، سیاسی اور سماجی مطالعہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اشاعتِ دوم، ۲۰۰۴ء، ص ۱۲۶

۱۴۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی، تاریخِ جدید اُردو غزل، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۸ء، ص ۸۰۱

۱۵۔ ڈاکٹر انور سدید، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: اے ایچ پبلشرز، اپریل ۱۹۹۶، طبع اول، ص ۴۶۸

۱۶۔ غلام حسین ساجد، پاکستان میں اُردو غزل (مضمون) مشمولہ سہ ماہی ''آئندہ''، پاکستانی ادب نمبر، کراچی، جلد ۱۱، شمارہ ۴۱، جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۶۷

۱۷۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۸۔ منیر نیازی، کلیاتِ منیر، لاہور: خزینہ علم و ادب، ۲۰۰۲ء، ص ۶۴

۱۹۔ ڈاکٹر رشید امجد، پاکستانی ادب (رویے اور رجحانات)، اسلام آباد: پورب اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۶۲